B.A.,B.COM (Hons) Part-II

Urdu Composition (50 Marks)

Sl. No.	Title	L.No.	Page
1.	(a) Koela Wala	1	1-4
	(b) Ji Aya Saheb		
2.	(a) Meer Kalloo Ki Gawahi	2	5-8
	(b) Maktubat-e-Ghalib		
	(c) Makatib Maulana Azad		
3.	(a) Khake-e-Hind	3	8-11
	(b) Mere Hamdam Mere-Dost		
4.	(a) Shaer ki Tamanna	4	12-14
	(b) Awara		
5.	Saaz Mustaqbil	5	14-16
6.	Daagh Ki Ghazalgoi ki Khusoosiat	6	16-21

© **Directorate of Distance Education, Patna University.**
No part of this booklet be reproduced in any form without permission in writing from Directorate of Distance Education, Patna University.

Class. B.A. Hons. Part II
Subject :- Urdu (50 Marks)
Lesson NO. 1 (Sarmaya-e-Adab)
(a) Kocle Wala (b) Jee Aaya Sahab.
Lesson Writer :- Dr. EJAZ ALI ARSHAD.
Head Deptt of Urdu, B.N. College.
PATNA

(a) کوئلے والا ـــــ اختر اورینوی

سنہ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے، سنہ ۱۹۷۷ء میں وفات پائی

(i) **مصنف کا تعارف :-** نام سید اختر احمد، اورین ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے۔ ایف۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد میڈیکل کالج پٹنہ میں داخلہ لیا۔ تین سال تک ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرتے رہے پھر تپ دق کے شکار ہو گئے اس کے سبب میڈیکل کی تعلیم ترک کر کے آرٹس کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اگلے سال یونیورسٹی میں استاد ہو گئے اور اختر اورینوی کے نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔ وہ تنقید نگار اور افسانہ نگار دونوں کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے شاعری بھی کی ہے اور ایک ڈرامہ بھی لکھا ہے صحافی کی حیثیت سے بھی انہوں نے اردو کی خدمت کی ہے۔

اختر اورینوی نے بہار کے دیہاتوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان میں زندگی کے کچھ پہلو اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ اختر صاحب نے نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے مگر وہ انہیں موضوعات تک محدود نہیں رہے بلکہ حیات و کائنات کے وسیع تر مسائل پر قلم اٹھایا۔ مجموعی طور پر ان کے افسانوں کا مزاج فلسفیانہ اور طرز بیان مرکب اور سنجیدہ ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "منظر و پس منظر" "کلیاں اور کانٹے" "انار کلی اور بھول بھلیاں" "سپنوں کے دیس میں" وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے سماج کے کمزور طبقوں سے متعلق جو افسانے لکھے ہیں انہیں پڑھ کر ان کی انسانی دوستی اور ترقی پسند ادبی تحریک سے قربت کا احساس ہوتا ہے ان کا اسلوب بہت جاندار اور تخلیقی ہے۔

(ii) **کوئلے والا کا خلاصہ اور تنقیدی جائزہ :-** اختر اورینوی کا یہ افسانہ ایک غریب کوئلہ بیچنے والے رمضانی کے گرد گھومتا ہے رمضانی ایک ایسے شہر کا کوئلہ والا ہے جو شہر کے کنارے ایک ٹوٹے ہوئے گھر کو ٹھیکے سے لیکر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اس میں رہتا ہے اس کی بیوی دمہ کی مریض اور بے حد بدمزاج ہے۔ رمضانی سیٹھ جی سے کوئلہ لیتا ہے اور ٹھیلے میں رکھ کر گلی گلی بیچتا ہے اس کے حلیے اور بھی لوگ ہیں اور سبھوں کا اپنا اپنا علاقہ ہے اس کے علاقے میں دو آدمی ہیں ایک وہ خود اور دوسرے پردیسی جو پردیسیا کہلاتا ہے۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ پردیسیا کو نیا مال نہیں دیا جاتا۔ اس پر الزام یہ ہے کہ اس نے پچھلا بقایہ ادا نہیں کیا ہے وہ لاکھ منت سماجت کرتا ہے مگر کوئی سنوائی نہیں ہوتی آخر وہ واپس جانے لگتا ہے اسی وقت رمضانی وہاں پہنچتا ہے اس کے ساتھ دوہری مصیبت ہے ایک تو بیوی شدید طور پر بیمار ہے اور گھر میں کھانے کے نام پر کچھ بھی نہیں۔ دوسرے گذشتہ رات ہونے والی بارش کے سبب کھلے میں رکھا ہوا کوئلوں کا ٹھیلا بھیگ گیا ہے اب بھیگا ہوا کوئلہ کون لیگا۔؟ رمضانی سوچتا ہے کہ سیٹھ اگر کوئلہ بدل دے تو بہت فائدہ ہو جائے گا۔ ظاہر ہے سیٹھ کے شیڈ میں تو کوئلہ دوبارہ سوکھ جائے گا مگر اس کے یہاں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ سیٹھ سے کوئلہ بدلنے اور نیا مال دینے کی درخواست کرتا ہے مگر سیٹھ دوسری ہی فکر میں ہے وہ ظالم اور تنگ دل تو ہے ہی، چالاک بھی ہے اسے معلوم ہو گیا ہے کہ ولایت کی لڑائی کے سبب چیزوں کے دام چڑھیں گے اس لئے وہ رمضانی کا بھیگا ہوا کوئلہ تو منشی جی کو کہہ کر رکھوا لیتا ہے مگر اسے تازہ کوئلہ دینے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ رمضانی خالی ٹھیلے کر باہر نکلتا ہے اور نہ معلوم کس نفسیاتی دباؤ کے تحت اسی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ روزانہ پھیری لگایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچ کر

اسے یکایک خیال آتا ہے کہ وہ مفت میں "کوئلہ لو کوئلہ لو" کی صدا لگا رہا ہے۔ آج تو اس کے پاس کوئلہ ہے ہی نہیں۔ پھر اسے یاد آتا ہے کہ اسی محلے میں ایک جگہ کوئلے کے دام باقی ہیں، وہ کئی بار آواز لگاتا ہے تو ایک لڑکا دو من کوئلوں کا دام لے کر نکلتا ہے۔ کل ایک روپیہ دو آنے ہیں جن میں سے نو آنے اس کے ساتھی پردیسیا کے ہیں مگر پیسہ ملتے ہی رمضانی سارا حساب کتاب بھول جاتا ہے، ایک ہوٹل میں جا کر بھر پیٹ کھانے اور چائے پینے کے بعد گھر کی طرف چل پڑتا ہے ایک لمحے کے لئے اسے کسی وعظ میں مولوی صاحب کی کہی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں کہ آدمی کو دو کے کا پیسہ نہیں ہڑپ کرنا چاہیے اور حق حلال کی کمائی کھانی چاہیئے۔ مگر اسے فوراً ہی اپنے دوست عید و کی یاد آتی ہے جو کہا کرتا تھا کہ بہت سے مولوی ملانٹ بس باتیں بنایا کرتے ہیں جن سے زندگی نہیں بن سکتی۔ اس کے بعد وہ پرسکون انداز میں واپس چل پڑتا ہے۔

اختر اورینوی کے اس افسانے میں گرچہ ان کی افسانہ نگاری کے تمام تر نمائندہ رنگ نہیں ہیں پھر بھی یہ ایک اچھا افسانہ ہے اتنا تو ظاہر ہے کہ اختر صاحب نے ایک کمزور اور غریب کردار کی کہانی پیش کی ہے جو سماج کے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں کوئی فلسفیانہ فکر بظاہر نہیں پیش کی گئی ہے کیونکہ یہ افسانہ ان کی افسانہ نگاری کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے مگر اختر اورینوی کے انفرادی اسلوب اور طرز فکر کی جھلکیاں یہاں موجود ہیں۔ یہ مثال دیکھئے۔

"شہر کے اندر اور باہر کوئلوں کے ڈھیر ایسے مردم خوار سیاہ دیو کی طرح معلوم ہو رہے تھے اس کا دماغ پتھر کوئلے کے چولہے کی طرح دہکنے لگا۔ اس کی چشم تصور کے سامنے عرس کے دیگ حضرت کی توند کی طرح نمودار ہوئے"۔

"بھور ہونے سے پہلے ہی بارش تھم گئی۔ دن نکلتے ابر کا خیمہ غریب چادر کی طرح چیتھڑا چیتھڑا ہو چکا تھا۔ افق میں سورج کبھی ابر کے گالوں سے جھانکتا تھا اور کبھی ہنس ہنس کر بادلوں میں ابن آدم کے حال کو دیکھ کر شرم سے منہ چھپا لیتا تھا"۔

اختر اورینوی نے رمضانی کے حالات زندگی، کوئلہ ڈپو کے مالک سیٹھ اور منشی وغیرہ کے بیان میں بے حد حقیقت نگاری کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے رمضانی کے علاوہ عیدو کا کردار بھی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ رمضانی پیروں فقیروں سے ملتا ہے، عرس اور میلوں میں حصہ لیتا ہے اور مزاروں پر جاتا ہے جب کہ عیدو تاڑی پیتا ہے اور گناہ کرتا ہے پھر بھی خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ قرض دار دونوں ہیں اور تنگ دستی کی زندگی دونوں کاٹ رہے ہیں دونوں کے کردار حقیقی ہیں۔

اختر اورینوی نے اس افسانے کے مکالمے بھی بڑی خوبصورتی سے لکھے ہیں اور مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے منہ میں ان کے ذہنی اور طبقاتی پس منظر کا خیال رکھتے ہوئے ویسی ہی زبان رکھنی ہے۔ اس لئے مجموعی طور پر افسانہ مؤثر اور کامیاب ہے

(ب) جی آیا صاحب ـــ سعادت حسن منٹو

(۱) مصنف کا تعارف: ۔ سعادت حسن منٹو اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں ۔ وہ ۱۹۱۳ء میں امرتسر کے منٹو خاندان میں پیدا ہوئے ۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز لاہور سے ہوا ۔ پھر وہ فلم میں کہانیاں لکھنے کے ارادے سے بمبئی چلے آئے ۔ انہوں نے افسانوں کے علاوہ خاکے اور ڈرامے بھی لکھے جو بلاشبہ تعریف کے قابل ہیں مگر جس صنف نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا وہ افسانہ نگاری ہے منٹو کو اپنے عہد کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا ۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔

منٹو کے افسانوں میں جنس کا پہلو سب سے نمایاں ہے وہ جنسی کجروی کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور گندگی کو چھپانے کے بجائے واضح کر دینے کو اصلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ اکثر ناقدوں نے اسی لئے ان کے افسانوں کو فحش نگاری کے زمرے میں رکھ دیا ہے مگر ہم ان افسانوں کی تہہ میں اتر کر دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ منٹو فحش نگار نہیں ہیں ایک کرب میں ڈوبے ہوئے انسان ہیں جو کسی حکیم کی طرح دھیرے دھیرے علاج کرنا نہیں چاہتے بلکہ نشتر لگانا چاہتے ہیں تاکہ زخم فوراً صاف ہو جائے ۔ وہ حکیم نہیں سرجن ہیں اس لئے ان کی تحریروں کو پڑھ کر فوری طور پر زیادہ تکلیف ہوتی ہے مگر ان کا اثر بھی فوراً ہوتا ہے ۔ منٹو کے افسانوں کی دوسری اہم خصوصیت نفسیات سے ان کی قربت ہے ۔ وہ انسانی ذہن کے پیچ و خم سے بخوبی واقف ہیں اور انسان کے عمل اور ردعمل کا اندازہ رکھتے ہیں ۔ اس لئے انہوں نے اپنے کرداروں کی مختلف حرکتوں کے نفسیاتی جواز پیش کئے ہیں ۔ منٹو رواں اور بے تکلف نثر لکھتے ہیں ۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ ہے ۔

(۶) جی آیا صاحب ۔ خلاصہ اور تنقید

منٹو کا افسانہ "جی آیا صاحب" ایک دس سال کے غریب بچے قاسم کی کہانی ہے جو کسی انسپکٹر کا گھریلو ملازم ہے۔ انسپکٹر صاحب کے علاوہ ان کی اہلیہ کی زیادتیاں بھی اس کا جینا دوبھر کئے دیتی ہیں۔ گھر کی صفائی، فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ پچاسوں برتنوں کو روزانہ صاف کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے اس کے علاوہ باہر کے کام الگ ہیں۔ کبھی بازار سے دہی لانے کی فرمائش ہوتی ہے، کبھی سوڈے کی بوتل۔ غرض یہ کہ بیچارہ قاسم مشین بنا ہوا ہے پھر بھی اسے چین نہیں۔ رات کے وقت جب سارے لوگ بستروں میں دبک جاتے ہیں وہ انتہائی نیند کے عالم میں بھی جوٹھے برتن دھوتا رہتا ہے اور منہ ہی منہ میں بدبداتا رہتا ہے۔

جی آیا صاحب ! جی آیا صاحب !

دراصل یہ ہر وقت "جی آیا صاحب" دہراتے رہنے کی بھی ایک نفسیاتی وجہ ہے۔ اس کے مالک انسپکٹر صاحب اسے بار بار کسی کام کے لئے آواز دیتے ہیں اور اس کے جواب دینے یا پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو جائے تو بہت خفا ہوتے ہیں اس لئے وہ لاشعوری طور پر "جی آیا صاحب" کا ورد کرتا رہتا ہے۔

بہر حال قاسم کے شب و روز اسی طرح گزرتے رہتے ہیں کہ ایک دن انسپکٹر صاحب اپنے دوستوں کی دعوت کرتے ہیں وہ قاسم کو ہدایت دیتے ہیں کہ مہمانوں کے آنے سے قبل پورا گھر صاف کر دے اور کھانے کے برتن وغیرہ قرینے سے لگا دے مگر میز پر رکھے ہوئے ان کے تیز دھار والے چاقو کو بالکل نہ چھیڑے۔ قاسم بڑی مشکلوں سے سارا کام ختم کرتا ہے تو اسے رات کو دعوت کے بعد جمع ہونے والے جوٹھے برتنوں کا خیال آتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آج رات پھر دیر تک جاگنا پڑے گا۔ کام کی سخت اور تھکن اس کے سامنے خوفناک دیو کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اسی وقت غلطی سے اس کے پاس اسے کھلا ہوا چاقو دکھائی دیتا ہے اور تب :-

"چاقو کو دیکھنا تھا کہ زبان پر یہ لفظ خود بخود جاری ہو گئے۔

چاقو ! تیز دھار چاقو ! یہی تمہاری مصیبت کو ختم کر سکتا ہے کچھ اور سوچے بغیر قاسم نے تیز دھار چاقو اٹھا کر اپنی انگلی پر پھیر لیا۔

ظاہر ہے کہ قاسم کی یہ حرکت ایک زبردست نفسیاتی دباؤ کا نتیجہ ہے۔ ڈھیر سارے برتن صاف کرنے کی تکلیف اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے سامنے چاقو کا وقتی زخم کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ انسپکٹر صاحب لاکھ ناراض ہوں مگر اب اسے برتن صاف کرنے کے لئے مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ زحمت سے بچ جاتا ہے۔ اسی لئے جب انسپکٹر صاحب کی بیوی بہتا ہوا خون روکنے کے لئے اس کی انگلی پر پٹی باندھ رہی ہوتی ہیں تو وہ غمزدہ ہونے کے بجائے ہنستا رہتا ہے۔

قاسم کی انگلی کا زخم چند دنوں میں ٹھیک ہو جاتا ہے تو پھر وہی بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ منظر دیکھئے :-

"قاسم ! صاحب کی جرابیں اور قمیض صاف کر ڈالو"

"بہت اچھا بی بی جی"

"قاسم ! اس کمرے کا فرش کتنا بدنما لگ رہا ہے، پانی لا کر ابھی صاف کرو۔ دیکھنا کوئی داغ دھبہ باقی نہ رہے"

"بہت اچھا صاحب"

"قاسم ! شیشے کے گلاس کتنے چکنے ہو رہے ہیں، انہیں نمک سے صاف کرو"

"جی اچھا صاحب"

"قاسم ! طوطے کا پنجرہ کس قدر غلیظ ہو رہا ہے اسے صاف کیوں نہیں کرتے"

"ابھی کرتا ہوں بی بی جی"

"قاسم ! بھاگ کر ایک آنے کا دہی تو لے آنا"

"ابھی چلا بی بی جی"

کاموں کی اس یورش سے گھبرا کر قاسم ایک دن پھر چاقو کی طرف لاشعوری طور سے ہاتھ بڑھا دیتا ہے اور چند دنوں کے لئے اسے آرام مل جاتا ہے۔ مگر ٹھیک ہوتے ہی کاموں کا پھر وہی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اب کے بار چاقو بھی میز پر نہیں تھا مگر داڑھی مونڈنے کا ایک بلیڈ اسے الماری میں مل جاتا ہے جس سے وہ اپنی انگلی زخمی کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے انسپکٹر صاحب اور ان کی بیوی اسے گھر سے نکال دیتے ہیں اور بقایا تنخواہ بھی ادا نہیں کرتے۔ وہ لاوارثوں کی طرح اسپتال کے ایک بیڈ پر پڑا رہتا ہے۔ اور ڈاکٹر اس کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ ہاتھ کاٹنا ضروری ہے ورنہ اس کی جان نہیں بچائی جا سکتی۔

منٹو کا یہ افسانہ گرچہ ان کے نمائندہ افسانوں میں نہیں ہے مگر افسانہ نگار کی حقیقت پسندی اور نفسیات سے اسکی گہری واقفیت افسانے کے ہر مرحلے سے ظاہر ہے۔ وہ سارا پس منظر جس میں دس سالہ قاسم اپنے ہی انگلی زخمی کرتا ہے۔ قاری کے دل میں قاسم کے لئے محبت اور انسپکٹر کے لئے نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ شاید یہی افسانہ نگار کا مقصد بھی ہے۔ انہوں نے انسپکٹر، اس کی بیوی اور قاسم کے کرداروں کو بالکل حقیقی بنا کر پیش کیا ہے اور ان کے منہ میں ایک مناسب زبان دی ہے۔

⁘

Class:- B.A. Hons. Part II

Subject urdu (50 Marks.)

Lesson NO. 2 (Sarmaya-e-Adab)

(a) Meer Kalloo Ki gawahi

(b) Maktubat-e-ghalib (C) Makatib Molana Azad

Lesson Writer:- Dr. EJAZ ALI ARSHAD.

B.N. College, PATNA-4

(a) میر کلو کی گواہی ——— انجم مانپوری

(i) مصنف کا تعارف :- "میر کلو کی گواہی" انجم مانپوری کا طنزیہ و مزاحیہ مضمون ہے۔ انہوں نے "کرائے کی ٹم ٹم" اور دوسرے مضامین بھی لکھے ہیں مگر "میر کلو کی گواہی" ان کا شاہکار ہے جس کا ترجمہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کیا گیا ہے اور یہ ڈرامے کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

انجم مانپوری کا اصل نام نور محمد اور والد کا نام شیخ باقر علی تھا۔ ۱۹۸۱ء میں مانپور (ضلع گیا) بہار میں پیدا ہوئے تھے اسی نسبت سے خود کو مانپوری لکھتے ہیں۔ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۴ء سے ہوا۔ انہوں نے رسالہ "رہنما" اور "ندیم" بھی نکالا۔ مانپوری کا شمار صف اول کے مزاح نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ اب تک ان کے انشائیوں اور طنزیہ مضامین کے چار مجموعے "طنزیات مانپوری" (اول و دوم) "مطائبات مانپوری" اور مرنے کے بعد منظر عام پر آ چکے ہیں۔

انجم مانپوری خود عدلیہ سے وابستہ تھے اس لئے عدالت، موکل، وکیل وغیرہ کے بارے میں آپ نے اپنے وسیع مشاہدے کی بنیاد پر بہترین مضامین لکھے ہیں۔ مانپوری شاعر بھی تھے اور ان کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ ان کی وفات ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

(۲) میر کلو کی گواہی ——— خلاصہ اور تنقیدی جائزہ

میر کلو کی گواہی میں انجم مانپوری یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ عدالتوں میں گواہ کے سچے ہونے سے زیادہ اس کا ذہین ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ اس طرح یہ مضمون عدالتی نظام پر ایک طنز بن جاتا ہے، جہاں شہادت اور گواہی ایک مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ صورت کل بھی تھی اور آج

بھی ہے۔ اس لئے آج سے تقریباً پچاس برس قبل لکھے جانے کے باوجود اس مضمون کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ اچھی اور عظیم تحریروں کی یہی پہچان ہوتی ہے۔

اس طنزیہ و مزاحیہ مضمون یا افسانے کی کہانی یہ ہے کہ ایک بار احسن اپنے گواہوں کے نہ آنے کی وجہ سے پریشان تھا اور مقدمے کی تاریخ بڑھانے کے لئے مہلت کی درخواست دے کر اپنے وکیل سے اطمینان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ یکایک اس کا کارپرداز گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ حاکم نے مقدمے کی تاریخ بڑھانے سے انکار کر دیا ہے۔ گواہوں کو ابھی حاضر کرنا ہے پکار ہو چکی ہے اور گواہوں کے حاضر نہ ہونے کی صورت میں مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔ احسن بہت گھبرایا مگر اس کے وکیل نے تسلی دی اور گواہی دینے میں ماہر جناب میر کلو بلائے گئے۔ یہ پیشہ ور گواہ تھے اور گواہی دینے میں اتنے ماہر کہ نہ مقدمے کا کچھ حال پوچھا نہ مدعا علیہ کا نام دریافت کیا بس اپنی فیس کے طور پر پانچ روپئے لئے اور حاکم کے روبرو جا کھڑے ہوئے۔ احسن نے سمجھا کہ مقدمہ چوپٹ ہوا۔ فریق ثانی نے بھی سوچا کہ یہ بھاڑے کا ٹٹو کہاں تک چلے گا۔ مگر جب بحث شروع ہوئی تو دونوں کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ میر کلو نے اپنی ذہانت اور چیف کے سوالات سے بس اتنا اندازہ لگا لیا کہ اصل قرضدار احسان علی خاں کا انتقال ہو چکا ہے اور وارث کی حیثیت سے ان کے بیٹے شاہنواز پر یہ نالش دائر کی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ وکیل صاحب کے سوالات کا جواب دینے لگے۔ ظاہر ہے کہ وہ مدعی یا مقدمے کے حالات سے بھی واقف نہ تھے مگر سوالوں کے جواب اتنی چالاکی کے ساتھ دیتے تھے کہ پکڑ میں نہ آتے تھے۔ سب سے پہلے مخالف وکیل نے خود انہیں کو موضوع گفتگو بنایا۔ وہ ایک بار جھوٹی شہادت دینے کی سزا میں جیل بھیج دیئے گئے تھے۔ وکیل نے اسی دکھتی رگ پر انگلی رکھی۔ مگر میر کلو نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ ملک کا ہر لیڈر ملک کی خدمت کے لئے کبھی نہ کبھی جیل جا چکا ہے اور میں نے بھی عدالت کی اصلاح کے لئے قانون توڑا اور جیل گیا۔

اصل گواہی شروع ہوئی اور مخالف کے وکیل نے سوالات شروع کئے تو میر کلو نے حد درجہ ذہانت سے کام لے کر ایسے جوابات دیئے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر۔ پھر بھی دوسرا کچھ نہ کر پاتا تھا۔ اس طرح کی گواہی کا ایک نمونہ دیکھئے۔

وکیل :- کیوں میر صاحب! احسان علی مرحوم کو آپ جانتے تھے؟

میر صاحب :- حضور! جانتے کی ایک ہی کہی، خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے، نہ مجھے ان کے بغیر آرام نہ ان کو میرے دیکھے بغیر چین۔

وکیل :- انکی عمر کیا تھی؟

میر صاحب :- یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان ہی تھی۔

وکیل :- یہ تیس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ صاف کہئے وہ بوڑھے تھے یا جوان؟

میر صاحب :- عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہیں تھے مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :- بال سفید تھے یا سیاہ

میر صاحب :- نزلہ کی وجہ سے بال سفید ہو گئے تھے لیکن جب خضاب لگاتے تھے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :- رنگ گورا تھا یا کالا؟

میر صاحب :- نہایت ہی گورے چٹے آدمی تھے لیکن وہی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ سانولا ہو گیا تھا۔

وکیل :- لانبے تھے یا ناٹے؟

میر صاحب :- قد تو لانبا تھا لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔

"میر کلو کی گواہی" کا یہ نمونہ اس بات کا فوری طور پر احساس دلاتا ہے کہ میر صاحب محض اپنی پیشہ وارانہ ذہانت سے کام لے کر سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ احسان علی خاں سے دن رات کی ملاقات کا دعویٰ کرنے والا ایک بار بھی ان سے ملا نہیں ہے مگر چالاک اتنا ہے کہ پکڑ میں نہیں آتا ہے اور شہادت دیئے چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وکیل صاحب اس کے انداز گفتگو پر اعتراض کرتے ہیں تو وہ یہ کہکر ان کو لاجواب کر دیتا ہے کہ احسان علی خاں سے اس کی کوئی ایک دو روزہ کی ملاقات تھوڑے ہی تھے جو اس کا حلیہ بیان کر دے۔ جس جس حالت میں دیکھا کہہ دیا۔

ظاہر ہے کہ میر کلو کا کردار بے حد جاندار ہے اور چونکہ یہ ایک طنزیہ اور مزاحیہ مضمون ہے۔ اس لئے اس میں کوئی پہلو ہونا ضروری نہیں۔ انجم مانپوری نے بڑے پر لطف انداز میں گواہی کا یہ منظر پیش کر کے ہمیں ہنسنے ہنسانے کا ایک موقع فراہم کیا ہے اور عدالت کے قانون

شہادت پر طنز کیا ہے۔ اس کوشش کا اصلاحی پہلو اگر ہے تو بس اتنا کہ عدالتوں میں رائج گواہی کے ناقص نظام کو سدھارا جائے مگر یہ ایک نیک خواہش اور تمنا کے سوا اور کچھ نہیں۔ مضمون کے اسلوب میں شگفتگی اور روانی ہے جس کے سبب مضمون مقبول ہوا۔

(۱۱) مکتوبات غالب

اسد اللہ خاں غالب اردو کے مشہور شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری کے علاوہ، نثر نگاری کے بھی نمونے چھوڑے ہیں جن میں انکے مکاتیب خاص اہمیت رکھتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جس طرح غالب شاعری کے میدان میں "انداز بیاں اور" کے مالک ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اسی طرح غالب کے خطوط بھی انفرادی خوبیوں کے مالک ہیں۔ غالب کی مکتوب نگاری کی خصوصیات درج ذیل ہیں۔

(۱) غالب نے القاب و آداب، مزاج پرسی اور خیریت لکھنے کا پرانا انداز جس نے ذرہ برابر الگ ہونا بھی پسند نہ کیا جاتا تھا، بالکل ترک کر دیا۔ ایسا نہیں کہ غالب یہ باتیں لکھتے ہی نہ تھے مگر اس سلسلے میں بنے ہوئے قاعدوں اور ان کی ترتیب کے پابند نہ تھے کبھی القاب و آداب لکھتے بھی تھے تو نئے، مختصر اور موزوں، [illegible] میاں، برخوردار، بھائی، بھائی صاحب، بندہ پرور، مہاراج، پیر و مرشد وغیرہ کبھی اس سے زیادہ کچھ لکھا تو "میری جان کہ ہیں، میاں [illegible] میرے مہربان" وغیرہ۔ مرزا الفت حسین کو برخوردار کا مگاریا "جان غالب" وغیرہ اسی طرح دعا سلام اور اپنا نام یا خط لکھنے کی تاریخ بھی کبھی لکھتے اور کبھی چھوڑ دیتے تھے اور کبھی اپنی بروز اق طبیعت کا اس طرح اظہار کرتے تھے۔

"۲۱ دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدن کا دن، جمعہ کے آٹھ بجا چاہتے ہیں، کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے۔"

(۱۱) غالب کے مراسلے (خط) کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ اس طرح خط لکھتے ہیں جیسے مخاطب سامنے بیٹھا ہوا اور وہ باتیں کر رہے ہوں اسی لئے انہوں نے بعض لوگوں کو خود بھی یہ لکھا ہے کہ ——— پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں، باتیں کرنی ہیں"۔

(۱۱۱) طرز مکالمہ گڑھنے میں غالب یہ جدت پیدا کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ (جس کو خط لکھا جا رہا ہے) کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ ان کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔

(۱۷) غالب کے خطوط کی بنیاد زیادہ تر مطلب نویسی پر ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ سیدھی سادی اور مختصر زبان میں اس طرح بات کہیں کہ پڑھنے والا فوراً ان کا مطلب سمجھ لے۔ شاعری حیثیت سے وہ اپنے پیچیدہ بیان کے مالک ہیں کہ ان کے کلام کی بیسیوں شرحیں لکھی جا چکی ہیں مگر خطوں میں وہ بیان کی سادگی پر زور دیتے ہیں، اور بے مطلب باتیں نہیں لکھنا چاہتے۔ مگر وہ دوسروں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ برابر خط لکھا کریں چاہے مطلب کچھ نہ ہو خود بھی دوستوں کو کبھی کبھی "شوقیہ خطوط" لکھے ہیں مگر اس میں خیر و عافیت کے ساتھ دلچسپی کی باتیں بھی ہیں۔

(۷) غالب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور خود ان کے قول کے مطابق ہر لفظ ان کے یہاں "گنجینۂ معانی کا طلسم" بن کر سامنے آتا ہے۔ ان کی اسی شاعرانہ ادا نے ان کے اردو خطوط کی نثر کو بھی پر لطف بنا دیا ہے۔ اردو میں خط لکھتے ہوئے گرچہ عام طور پر وہ بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ایسے نادر استعاروں اور تشبیہوں کا استعمال جن سے ان کا اظہار زیادہ موثر، معنی خیز، تہہ دار، اور شگفتہ ہو جاتا ہے۔

(۷۱) غالب نے اپنے خطوط کے درمیان خود اپنے اشعار بھی استعمال کئے ہیں اور دوسروں کے بھی۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جو بار بار لکھے گئے ہیں اور ہر جگہ ایک نیا لطف دیتے ہیں۔ عام طور پر اشعار اور مصرعے ان کے بیان کے تسلسل اور اس کی روانی میں شامل ہو جاتے ہیں۔

(۷۱۱) غالب کے خطوط میں مرقع نگاری کی مثالیں کم ملتی ہیں مگر جن چند لوگوں کا سراپا انہوں نے بیان کیا ہے وہ جیتے جاگتے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش بھی غالب کے خطوط میں ہی ملتے ہیں۔

(۷۱۱۱) غالب کے خطوں کی ایک اہم خصوصیت ان کی شوخی تحریر اور ظرافت ہے زندگی بھر مصیبتوں کا سامنا کرنے کے باوجود غالب کی زندہ دلی آخر تک باقی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے حال زار پر بھی خندہ زن ہوتے اور چٹکیاں لیتے رہے مگر دوستوں یا عزیزوں کے سامنے کبھی افسردگی کا اظہار نہ کیا۔

غالب نے سب سے زیادہ خطوط یعنی کل ایک سو تیس مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھے ہیں ان میں غالب کے خطوط کی بیشتر خصوصیات جن کا ابھی ذکر ہوا یعنی القاب و آداب کا اختصار، مکالمے کو مراسلے بنانا، اشعار کو نثر کا حصہ بنا دینا، شوخی اور ظرافت کا اظہار وغیرہ موجود ہیں غالب کی خطوط نویسی کا آغاز ۱۸۵۰ء میں ہوا ۱۸۶۱ء کے بعد وہ صرف اردو میں خط لکھتے رہے۔ ان کے خطوط کے مجموعے "عود ہندی، اردوئے معلی،

مکاتیب غالب" اور "غالب کے خطوط" (مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم) کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

(C) مکاتیب مولانا آزاد

مولانا آزاد اردو کے ایک اہم نثر نگار ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن سے ایک اہم کتاب "غبار خاطر" بھی ہے۔ یہ مولانا آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے قلعہ احمد نگر میں قید کے دوران اپنے دوست نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شیروانی کو لکھے تھے۔

مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ان کے اباء و اجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ کچھ عرصے یہ لوگ آگرہ میں رہے اور پھر مستقل طور پر دہلی میں رہنے لگے۔ مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین نے مکہ معظمہ میں اپنے لئے مکان بنوایا اور وہیں مدینہ منورہ کے ایک عالم شیخ محمد طاہر وتری کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ مولانا آزاد وہیں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے اور ان کا تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا گیا۔ بعد میں وہ اپنا نام محی الدین احمد لکھتے رہے اور قلمی نام ابوالکلام آزاد رکھا۔ مولانا نے ادب کے علاوہ سیاست اور مذہب میں بھی گہری دلچسپی لی اور آزادی ملنے کے بعد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم ہوئے، اسی حیثیت سے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا آزاد کے خطوط ان کی تخلیقی قوتوں اور انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "غبار خاطر" کے گل کا ردریچے سے فنکار کا چہرہ جھانکتا نظر آتا ہے گویا مولانا آزاد کی تہہ دار اور رنگا رنگ شخصیت کے سارے نقوش ان کے خطوں میں ابھر آئے ہیں۔ مولانا آزاد نے بقول محمد اجمل خاں صاحب نثر میں شاعری کی ہے اور سچ پوچھئے تو ان کے خطوط نثری نظم کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔

مولانا آزاد کے خطوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جزئیات نگاری، اور منظر نگاری پر پوری قدرت حاصل ہے وہ ہر بات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں اور جیل میں پھیلے ہوئے مناظر کی تصویر اتارنے میں فکری انداز اختیار کرتے ہیں اور واقعات کے سہارے فلسفیانہ نکات بھی پیش کر دیتے ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنے خطوں میں اردو، عربی اور فارسی کے اشعار کثرت سے استعمال کئے ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ اشعار برجستہ استعمال ہوئے ہیں اور کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے شعر ذہن میں آگیا ہے اور پھر اس کے بارے میں نثر لکھی گئی ہے۔ دراصل مولانا کو اشعار کافی یاد تھے۔ اس لئے موقع قلم کی نوک پر آجاتے تھے۔

مولانا آزاد کے خطوط کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ ان سے جیل کے حالات کے علاوہ اس زمانے کے سیاسی رجحانات اور مولانا یا دوسرے رہنماؤں کی زندگی کے ایسے بہت سارے واقعات پر روشنی پڑتی ہے جن کا کسی اور ذریعہ سے علم ہونا مشکل تھا۔

Class:- B. A. Hons. Part II

Subject:- Urdu (50 Marks)

Lesson. No. 3 (Sarmaya-e-Adab)

(a) Khaak-e-Hind (b) Mere Humdam Mere Dost

(a) خاک ہند ـــــ پنڈت برج نرائن چکبست

(۱) شاعر کا تعارف:- ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ سے قریب فیض آباد میں پیدائش ہوئی بعد میں لکھنؤ میں رہنے لگے۔ نام پنڈت برج نرائن چکبست اور تخلص بھی چکبست تھا شاعری انہیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد پنڈت اودت نارائن چکبست بھی شاعری کرتے تھے ان کا تخلص یقین تھا۔ چکبست پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور لکھنؤ کے مشہور وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا تھا ۱۹۲۶ء میں رائے بریلی کے اسٹیشن پر فالج کا شکار ہوئے اور چند گھنٹے میں انتقال کر گئے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "صبح وطن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

چکبست نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی غزلوں پر غالب اور آتش دونوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ مگر بنیادی طور پر وہ قومی شاعر تھے اور انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ ملک کے نوجوانوں کو وطن کی محبت اور اس کی ترقی کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے نوجوانوں میں وطن پرستی کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ مگر وہ پرانے خیال کے حامی نہ تھے۔ مغربی تہذیب و تمدن سے وہ نالاں ضرور تھے مگر مغربی تہذیب سے اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہوئے مغرب کی اچھی باتوں کو قبول کر لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اسی خیال کے تحت وہ ہوم رول کے مطالبے کے دل سے حامی تھے۔ بہرحال اپنے کلام میں انہوں نے اس عہد کے سماجی اور سیاسی حالات کو بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

چکبست نے اردو کے بزرگ شاعروں کا کلام بغور پڑھا تھا اور اس سے فائدہ حاصل کیا تھا۔ اس لئے ان کے کلام کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فنی رموز و نکات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی نظمیں اپنی روانی، زور بیان اور موضوع کے اعتبار سے قابل تعریف ہیں۔ اس لیے چکبست کا شمار اردو کے قادر الکلام شاعروں میں ہوتا ہے۔ چکبست کی شاعری اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ابتدا سے ہی اردو زبان اور ادب کے ارتقا میں اس ملک کے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں نے حصہ لیا ہے۔

خاک ہند کا خلاصہ اور تنقیدی جائزہ

چکبست کی نظم "خاک ہند" ان کے انداز سخن کی آئینہ دار ہے۔ اس نظم میں چکبست نے بہت خوبصورت انداز میں وطن کی عظمت اور محبت کے گیت گائے ہیں اور مختلف چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے آپس میں لڑنے والے ہندوستانیوں خاص طور پر ہندوستانی جوانوں کو وطن کی محبت کے نام پر متحد کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ ہندوستان کی کھوئی ہوئی شان و شوکت دوبارہ واپس آسکے۔ ظاہر ہے کہ یہ نیک جذبہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ابھرنے والے اکثر شاعروں کے دل میں موجود رہا ہے۔ اقبال نے بھی وطن کے گیت گائے ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی ہے۔ چکبست بھی سوئی ہوئی قوم کو بڑے فنکارانہ انداز میں جگانا چاہتے ہیں۔

چکبست ہندوستان کی سرزمین اور یہاں کی مٹی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی بلندی میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ قدرت کے فیض کا دریا اس کے لئے رواں ہے۔ اس کی پیشانی سے حسن ازل (اللہ تعالیٰ) کا نور نمایاں ہے۔ اس کی زیب و زینت کی اس کی عظمت اور شان و شوکت کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ ہمالیہ ہندوستان کی عظمت کا نشان ہے اور خود ہمالہ کی یہ شان ہے کہ ہر صبح آفتاب اپنی کرنوں سے اس کی چوٹی کو گوندھتا ہے۔

چکبست ہندوستان کی سرزمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیری ہی خاک سے چشمے جاری ہوئے جن سے چین و عرب میں ہریالی آئی۔ جب سارے جہان میں وحشت کے بادل چھائے ہوئے تھے تب بھی اس علاقے میں علم و ادب کا چراغ روشن تھا اور اس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جن ابتدائی بندوں کا یہاں خلاصہ پیش کیا گیا، ان میں چکبست نے شاعرانہ انداز اور زور تخیل کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ روشن سورج کو اپنی کرنوں سے ہمالہ پہاڑ کی چوٹی گوندھتے ہوئے دکھانا نزاکت بیان کا اچھا نمونہ ہے۔ دوسری طرف چکبست نے کنایہ سے بھی کام لیا ہے۔ گوتم بدھ کی تعلیمات سے پوری دنیا میں روشنی پھیلی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بند میں بڑی لطافت کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ جب یونان کی محفلیں سونی تھیں تب بھی یہاں علم و ادب کے چراغ روشن تھے اور اسی سرزمین سے حکمت اور معرفت کے ایسے چشمے جاری ہوئے جن سے چین اور عرب کے لوگوں نے علم کی پیاس بجھائی۔ یہاں گوتم بدھ کے علاوہ دوسرے عالموں اور فلسفیوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو اس سرزمین سے اٹھے اور دنیا پر چھا گئے۔

تیسرے بند میں چکبست استعاروں اور کنایوں کو چھوڑ کر براہ راست انداز بیان اختیار کرتے ہیں۔ اور گوتم بدھ کا نام لیتے ہیں جنہوں نے ہندوستان جیسے قدیم ملک میں ایک نئی جان پیدا کی۔ اسے ایک نئی عزت کا مستحق بنایا۔ وہ سرمد کا ذکر کرتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے وطن کو ترک کر کے ہندوستان میں رہنا پسند کیا اور اپنی تعلیمات سے دنیا کو فیض پہنچایا۔ وہ اکبر اعظم کا تذکرہ چھیڑتے ہیں جس نے ہندوستان میں محبت اور ہمدردی، آپسی بھائی چارے اور رواداری کا ایک نیا دور شروع کیا۔ وہ ہندوستان کے سارے بہادروں کا قصہ چھیڑتے ہیں جنہوں نے اپنے

اپنے خون سے ہندوستان کی دھرتی کو سینچا اور جو اس مٹی کا حصہ بن گئے۔ آج بھی ان کے اثرات ہندوستان کے در و دیوار سے ظاہر ہیں اور ہندوستانیوں کی رگوں میں ان کا خون رواں ہے۔ آج بھی مندروں سے ناقوس کی جو آوازیں بلند ہوتی ہیں، ان میں تاثیر ہوتی ہے۔ آج بھی مسجدوں کے میناروں سے اذان کی جو صدائیں کان میں آتی ہیں وہ جنت سے آئی ہوئی آوازیں معلوم دیتی ہیں۔ آج بھی کشمیر کی وادی جنت کا نقشہ پیش کر رہی ہے اور آج بھی دریائے گنگا کا پانی شان و شوکت کے ساتھ بہہ رہا ہے۔

چکبست ایک رجائیت پسند شاعر ہیں۔ اس لئے وہ مخالف نظاروں سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ یہ احساس دلاتے ہیں کہ ساری دشواریوں کے باوجود آج بھی ہندوستان کے پھلوں اور پھولوں میں پہلے جیسی تازگی ہے۔ جنگلوں میں مور ناچتے ہیں۔ بجلی اسی طرح کڑکتی ہے اور وطن کی مٹی اسی طرح زرخیز ہے بس کچھ کمی ہے تو یہاں کے لوگوں میں ہے جو وطن کی محبت اپنے دلوں میں نہیں رکھتے۔ ان کے دل کے حوصلے پست ہو گئے ہیں ان میں سستی آگئی ہے اور وہ وطن کی عظمت کو پامال ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں پھر بھی خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کا علم و حکمت، ایمان اور یقین کا سرمایہ برباد ہو رہا ہے اور ہندوستان ایک بے کفن لاش کی طرح ہو گیا ہے اس کے باوجود یہاں کے لوگ موت کی نیند سوئے ہوئے ہیں۔

چکبست اپنی نظم کے آخری دو بندوں میں دعا کرتے ہیں کہ وطن کی محبت کا جو صور انہوں نے پھونکا ہے وہ مردہ دلوں کو جگا دے۔ ان کی یاد بھولے ہوئے افسانے یاد دلا دے اور مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے۔ اس خاک وطن سے پھر عمل اور یقین کے شرارے اور محبت کی چنگاریاں پھوٹیں۔ وطن کی محبت آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہو کر ایک نشے کی طرح ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر چھا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ جو باغ کے شیدائی ہیں ان کو سرو اور سمن مبارک ہو، جو رنگین طبیعتوں کے مالک ہیں ان کو شعر و شاعری مبارک ہو۔ بلبل کو گل (پھول) مل جائے کیونکہ وہ اسی کا عاشق ہے، پھول کو چمن مبارک ہو اور ہم بے کسوں کو، بے سہارا لوگوں کو اپنا پیارا وطن مبارک ہو۔ ہمارے دل کے غنچے اسی وطن کے باغ میں کھل کر پھول بنیں گے۔ ہم اسی خاک سے اٹھے ہیں اور اسی خاک میں مل جائیں گے۔ یہی ہماری کامیابی اور معراج زندگی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو چکبست کی یہ نظم ابتدا سے آخر تک وطن پرستی اور حب الوطنی کے جذبات سے بھری ہوئی ہے۔ نظم میں بہت روانی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک وطن پرست کے دل سے نکلی ہوئی آواز الفاظ کی شکل میں ڈھل کر تاثیر کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچ گئی ہے۔ چکبست نے اپنے وطن کی دیرینہ عظمت کے ساتھ ساتھ موجودہ بدحالی کا بھی ذکر کیا اور تمام مسائل کے حل کے لئے جو دوا تجویز کی ہے وہ ہے حب الوطنی۔ نظم بہترین جذبات کی عمدہ پیش کش کا نمونہ ہے۔

(ا) (و) میرے ہمدم میرے دوست ـــــ فیض احمد فیض

(۱) شاعر کا تعارف:۔ فیض احمد نام اور فیض تخلص ہے۔ ۱۹۱۲ء میں سیالکوٹ میں پیدائش ہوئی۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد معلمی کا پیشہ اختیار کیا۔ کئی اداروں اور اخباروں سے وابستہ رہے۔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہنے کے سبب پاکستان بننے کے بعد قید و بند کی تکلیفیں جھیلتے رہے۔ فیض نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں جگہ رومان کے ساتھ ساتھ حقیقت کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ وہ ابتدا سے ہی ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ رہے اور مزدوروں، محنت کشوں اور غریبوں کے مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے رہے۔ سامراجی نظام سے ان کی نفرت کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے انگریزی حکومت کی مخالفت کی جو ہندوستان میں سامراجیت کی نمائندہ تھی۔ فیض کے شعری مجموعے "نقش فریادی"، "دست صبا"، "زنداں نامہ"، "دست تہہ سنگ" اور "شام شہر یاراں" وغیرہ کے نام چھپ چکے ہیں۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا۔

میرے ہمدم میرے دوست : خلاصہ اور تنقیدی جائزہ

نظم "میرے ہمدم میرے دوست" فیض کے انفرادی رنگ سخن کی آئینہ داری کرتی ہے۔ غم عشق اور غم روزگار، غم جاناں اور غم دوراں کے خوبصورت امتزاج سے فیض ایک حسین فضا تیار کر دیتے ہیں۔ انقلاب کے لئے جس تیاری کی ضرورت ہوتی ہے اسکی طرف فیض

بجا طور پر اشارہ کیا ہے وہ اقبال کے اس خیال سے اتفاق رکھتے ہیں کہ لوگوں میں ذوق نغمہ کم ہو جائے تو آواز کو زیادہ تلخ بنانا پڑتا ہے تب ہی اس میں اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ سوئی ہوئی قومیں اگر آسانی سے نہ جاگیں تو انہیں بھی گیت سنانے کی جگہ ٹھوکر لگانی پڑتی ہے۔

نظم ظاہری طور پر "آپ بیتی" ہے ایسا لگتا ہے کہ شاعر کے کسی دوست نے ان سے غم دل کا علاج کرنے کے لئے گیت سنانے کی فرمائش کی اور اس کی بے التفاتی کا شکوہ کیا۔ جواب میں شاعر نے اپنے اس نقطہ نظر کا اظہار کیا کہ ؎

اگر مجھے اس کا یقین ہو میرے ہمدم میرے دوست
اگر مجھے اس کا یقین ہو کہ ترے دل کی تھکن
تری آنکھوں کی اداسی ترے سینے کی جلن
میری دل جوئی مرے پیار سے مٹ جائے گی

روز و شب میں تجھے بہلاتا رہوں شام و سحر
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے، شیریں
پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا

بغور دیکھا جائے تو پوری نظم کا مرکزی خیال انہیں اشعار میں پوشیدہ ہے باقی جو کچھ ہے اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ مگر یہ مختصر سی بات "آپ بیتی" ہوتے ہوئے بھی دراصل "جگ بیتی" ہے۔ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ چاہے اس کا ذاتی احساس ہی کیوں نہ ہو پوری انسانیت کے لئے نشان راہ ہے۔ شاعر کا یہ نقطہ نظر واضح ہے کہ موجودہ مسائل کے لئے شعر و نغمہ اور طاؤس و رباب کی نہیں، شمشیر و سناں کی ضرورت ہے۔ جس مہلک زخم نے قوم کے جسم و دل میں گھر بنا لیا ہے اس کے لئے مرہم کی نہیں نشتر کی ضرورت ہے اور یہ نشتر بھی اسی وقت لگایا جا سکتا ہے جب قوم کا مزاج اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو ؎

وہ یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

میرا خیال ہے کہ ان سطروں میں ترمیم و اضافہ کیا گیا ہے وہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اور نظم ان سطروں کے بغیر بھی مکمل تھی مگر فیض نے بات کو کچھ پھیلا بھی دیا ہے اور ایسا وہ پہلے بھی کر چکے ہیں۔ پہلے بند میں بھی حاجی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ اور دوسرے بند میں سطریں زائد ہیں۔ فیض اس طرح شاید نظم میں زیادہ تاثیر پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔

فیض کی یہ نظم فنی اعتبار سے حد کامیاب ہے نظم کے درمیانی حصے میں جو رچاؤ ہے، جو تشبیہات و استعارات کا حسن اور جذبات کی شدت ہے۔ جو پیکر تراشی اور شاعرانہ بیان ہے۔ وہ نظم کی مقبولیت کا بھی سبب ہے اور انفرادیت کا بھی۔ صاف ظاہر ہے کہ فیض کے تصور میں عشق ہے اور نگاہ میں حالات کی سنگینی کا منظر۔ ایسے میں فیض نے حقیقت کو رومان سے آراستہ کر کے پیش کیا ہے۔ یہ اشعار ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں ؎

کیسے مفرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں

مجموعی طور پر فیض کی یہ نظم ان کی مقصدیت اور حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ رومان پسندی اور فنی پختگی کی دلیل ہے۔ پوری نظم میں ربط اور تسلسل نمایاں ہے۔

DR. EJAZ ALI ARSHAD, HEAD DEPTT OF URDU. B.N. COLLEGE PATNA.

LESSON NO. 4 (SARMAYA-E-ADAB)

(a) SHAER K. TAMANNA – Jameel.

(b) AWARA – Majaz.

(a) (a) شاعر کی تمنا : علامہ جمیل مظہری

(۱) **شاعر کا تعارف** :- میر کاظم علی نام اور جمیل مظہری قلمی نام ہے۔ ۱۹۰۴ء میں پٹنہ سیٹی کے محلہ مغل پورہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے کو دادا محترم سید مظہر حسن کی نسبت سے مظہری لکھتے ہیں جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے اور شاد عظیم آبادی کے دوست جمیل کے والد کا نام سید خورشید حسین ہے۔ شاعری جمیل مظہری کو وراثت میں ملی تھی ان کے دادا اور والد دونوں شاعر تھے چھوٹے بھائی سید امیر رضا بھی رضا مظہری کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ جمیل مظہری نے ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سیٹی میں حاصل کی۔ اس کے بعد موتیہاری اور مظفر پور میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ کلکتہ یونیورسٹی سے ایم، اے، پاس کرنے کے بعد حکومت بہار کے محکمۂ تعلقات عامہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہوئے مگر جنگ آزادی کے دوران وہاں سے استعفیٰ دیکر پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں استاد مقرر ہوگئے۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد کلکتہ میں زندگی گذارتے رہے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۸۰ء کو اپنے آبائی گاؤں بھیکن پور (ضلع مظفر پور، بہار) میں راہیٔ ملک عدم ہوئے۔

جمیل مظہری نے شاعری کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام کے مجموعے "نقش جمیل" "فکر جمیل" "عرفان جمیل" وغیرہ کے نام سے شائع ہو چکے ہیں انہوں نے نثر میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مگر وہ بنیادی طور پر نظم نگار ہیں۔ ان کی نظم نگاری میں فن و فکر کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ ڈاکٹر اجمل اجملی نے اس بارے میں لکھا ہے۔

ان کا ذہن ایک فلسفی اور ایک مفکر کا ذہن تھا اب اگر آپ اس کی کرشمہ [illegible] نظموں میں دیکھنا چاہیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان کی ہر نظم اپنے پیچھے ایک تراشا ہوا شعور اور ایک سوچی سمجھی فکر رکھتی ہے اس کے یہ معنی قطعی نہیں [illegible] اری نظمیں خشک فلسفے سے بھری ہوئی ہیں"۔

جمیل مظہری کو ان کی شاعرانہ خدمات کے اعتراف میں ملک کے کئی ادبی انعامات حاصل ہوئے تھے۔

(۲) آوارہ :- خلاصہ اور تنقیدی جائزہ

مجاز کی نظم "آوارہ" ان کے دکھی دل کی آئینہ دار ہے۔ بظاہر یہ آپ بیتی ہے مگر اس میں اپنے عہد کے تمام نوجوانوں کا غم پوشیدہ ہے جو مایوس اور غمزدہ ہیں۔ نظم میں خوبصورت تشبیہوں، استعاروں اور ترکیبوں نے جان ڈال دی ہے۔ جیسے ؎

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کی عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

نظم کی ابتدا سے ہی ایک افسردہ ماحول جاگتا دکھائی دیتا ہے اس کے بعد شہر کی مختلف رنگینیوں اور رعنائیوں کا تذکرہ کر کے "اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں" کی تکرار اس افسردگی کی فضا کو گہرا کرتی جاتی ہے اور شاعر کے ارادے مثلاً عہد وفا کے توڑنے کسی کا انتظار ترک کرنے، مردہ چاند تارے نوچ لینے وغیرہ کے ارادے، ایک فطری رد عمل کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ نظم کے آخری حصے میں چنگیز

کے ہاتھوں سے خنجر چھین کر توڑ دینے، اس کے تاج پر دمکتے ہوئے پتھر کے توڑ دینے یا اس کی محفل عشرت کے ساز و سامان بکھیر دینے اور بادشاہوں کے محل میں آگ لگا دینے کے جو ارادے ظاہر کئے گئے ہیں وہ ترقی پسند تحریک کے اثرات اور اس سے مجاز کی وابستگی کا نتیجہ ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ مجاز نے "آوارہ" میں ایک افسردہ اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا عام نوجوان کے درد کو پیش کرنا چاہا ہے کہ شہر کی رات روشن ہے آسمان پر چاند بھی ہے اور تارے بھی، میخانے آباد ہیں، بالاخانے سجے ہوئے ہیں، ہر قدم پر رنگینیاں اور رعنائیاں بکھری ہوئی ہیں اور عشرت دعوت دے رہی ہیں مگر اس کے دل کا دکھ درد کوئی نہیں سمجھتا۔ اس کے دل میں جو آگ لگی ہوئی ہے اسے کوئی نہیں محسوس کرتا۔ اس نے جو عہد وفا باندھ رکھا ہے وہ اسے بہکنے نہیں دیتا مگر اسی کے سبب ہزاروں بلائیں اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ اب یہ تھکتا اور ہارتا ہوا نوجوان اس پورے نظام کو بدل دینا چاہتا ہے اور بار بار اپنے غم دل سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے کہ آخر وہ اپنے کام کا آغاز کس طرح کرے؟

مجموعی طور پر نظم بے حد اثر انگیز اور جذبات کی شدت سے مالا مال ہے مگر اس میں ارتقائے خیال کی کمی ہے۔

(۱) آوارہ ۔ مجاز

(۱) شاعر کا تعارف:۔ اسرار الحق نام اور مجاز تخلص ہے۔ ردولی ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ اس زمانے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کا ایک بڑا طبقہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھا۔ مجاز بھی انہیں لوگوں میں تھے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد وہ مختلف ملازمتیں کرتے رہے اور آخر میں لکھنؤ میں رہنے لگے۔ انہوں نے غلامی کی لعنتوں کا گہرا مشاہدہ کیا جو نوجوانوں اور خاص کر متوسط مسلم طبقے کے نوجوانوں کو پریشان کر رہی تھیں اس لئے وہ عمر بھر اپنی شاعری کے ذریعہ نوجوانوں کو اس فرسودہ نظام کے بدل دینے کی دعوت دیتے رہے۔

مجاز کی وفات ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ اس وقت تک ان کی نظمیں "رات اور ریل" اور "میرا چمن" وغیرہ خاص طور پر مقبول و مشہور ہو چکی تھیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں انقلاب کے ساتھ ساتھ عشق اور رومان کے رنگ بھی موجود ہیں۔ دراصل ان کا ذہن طبقے کے ایک ایسے نوجوان ذہن کی عکاسی کرتا ہے جو موجودہ نظام حیات اور حکومت سے نالاں ہو کر احتجاج بھی کرتا ہے اور فرسٹریشن یا جھنجھلاہٹ میں بھی مبتلا رہتا ہے۔ ساتھ ہی ایک رومان پرور زندگی کے خواب بھی دیکھتا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے۔

"مجاز حسن کی درد آفرینی اور اس کے ذریعہ ابھرنے والی شائستگی اور تہذیبی نفاستوں اور انسانی رشتوں کی معنویت کا شاعر ہے۔ ابتدائی دور کی غزلوں سے لے کر آخری دور تک حسن کا یہ پاس اور لحاظ، یہ انسانی رشتوں کا احترام اور اس کی کائنات آفرینی کا تذکرہ برابر قائم ہے اور ایک دکھے ہوئے دل کے ساتھ گیا ہے۔"

مجاز کے اسلوب میں بڑا والہانہ پن ہے مگر شائستگی کے ساتھ۔ ان کے مخصوص آہنگ میں توانائی بھی ہے اور عنائیت بھی۔ وہ اپنے دور کے نوجوانوں کی جذباتی اور انفرادی کشمکش کی موضوع اور اسلوب دونوں سطحوں پر نمائندگی کرتے ہیں۔

(۲) شاعر کی تمنا : خلاصہ اور تنقیدی جائزہ

جمیل مظہری کی نظم "شاعر کی تمنا" ان کے فلسفیانہ ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ اس میں جذبات کی ہلچل بھی ہے اور فکر کا رکھ رکھاؤ بھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اردو کی کلاسیکی شاعری میں استفادے کے ساتھ ساتھ جمیل مظہری نے کچھ نئے رجحانات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ ان کی ایک نمائندہ اور خوبصورت نظم بن گئی ہے۔

جمیل مظہری نے اس نظم میں زندگی کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا ہے۔ اور وہ نظریہ کیا ہے اس کی زبان سے سنئے۔

عرض اس حسرت واندوہ ویاس وغم کی بستی میں
کہیں درد آفریں ہوتا کہیں درد آشنا ہوتا

پوری نظم میں اس مرکزی خیال کو مختلف مثالوں سے واضح کیا گیا ہے نظم چونکہ شاعر کی تمناؤں پر مشتمل ہے اس لئے اس کا انداز دعائیہ ہے۔

جمیل مظہری اپنی تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اول تو اس دنیا میں میرا آنا ہی ضروری نہ تھا۔ جب میں کچھ نہ تھا تو خدا کے وجود کا ایک حصہ تھا اور کچھ نہ ہوتا تو بھی وہی ہوتا۔ اس لئے دنیا میں آنے سے میری حیثیت گھٹ گئی۔ لیکن اگر میری تقدیر میں لکھا ہی تھا کہ میں دنیا میں آؤں تو یہاں آکر کسی ضرورت مند اور حاجت مند کے کام آتا۔ کاش میں پھولوں کی مٹھی میں بلبل کا دل بنکر رہتا۔ گناہوں میں نقصان دعاؤں میں اثر بن کر رہتا۔ محبت کی نظر اور حسینوں کی ادا ہوتا، محنت کے چہرے کا فروغ اور دولت کے دامن کا غبار ہوتا، غیرت کی پیشانی کا غم اور زلف رسا کا زخم ہوتا۔ کاش کہ میں کسی ترچھی ٹوپی میں لگے ہوئے پھولوں کے طرہ میں شامل ہوتا اور اس ترچھی ٹوپی کا نام نہاد اور جھوٹی شان وشوکت اور غرور کی ہنسی اڑا سکتا۔ کاش میں کسی مغرور کی گردن پر احسان کا بوجھ بن کر رہتا یا کسی ظالم کے دل میں لادوا درد بن کر رہتا کبھی میں کسی نادار کی نظروں میں اس شرم وحیا کی صورت میں رہتا، جو التجا کے کرب سے پیدا ہوتی ہے، کبھی حاجت روائی کی خواہ اور کبھی جنگل کی اندھیری رات میں جوگی کا دیا بنکر کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو منزل کا پتا دیتا۔ کبھی کسی بیمار اور غریب انسان کے سرہانے شمع بن کر اس کے غمکدے کو روشن کرتا اور کبھی کسی نادار انسان کے گھر کے چولہے میں چنگاری کی صورت میں دبا رہتا اور آنے والے کل کا انتظار کرتا جب چولہا جلے گا اور کھانا بنے گا کاش ایسا ہوتا کہ میں کسی کنجوس اور فاقہ کش یعنی اس کی کنجوسی کے سبب فاقہ کشی کی نوبت ہے ورنہ اس کے پاس پیسوں کی کمی نہیں) کی جیب میں رکھی ہوئی اشرفی بن کر کسی بے عذر یتیم اور بے کس وبے نوائی راہ میں گر جاتا جس سے اس کی مشکل آسان ہو جاتی۔ جب میں عدم وجود میں آیا ہی تھا اور اس عبرت انگیز تمدن میں قدم رکھا ہی تھا تو کاش میں کسی بوڑھے اور اندھے فقیر کے ہاتھوں کا عصا (لاٹھی، ڈنڈا) بن جاتا۔ یا کسی ٹوٹے ہوئے جھونپڑے میں رہنے والے کسان کی بانسری بن کر آدھی رات کے سناٹے میں زندگی کی حقیقت ظاہر کر رہا ہوتا۔

ظاہر ہے کہ یہ بڑی لطیف وجمیل تمنائیں ہیں اور ان سب کا مدعا بس اتنا ہے کہ جمیل مظہری اس فانی دنیا میں بے مقصد اور بے فیض زندگی نہیں گزرنا چاہتے۔ وہ بہتے ہوئے آب زندگی پر کوئی ایسا نقش بنا کر دنیا سے جانا چاہتے ہیں جو ان کی یاد تازہ رکھے۔ وہ کسی دردمند کے درد کا مداوا کرنا چاہتے ہیں تو کسی ناآشنائے غم کو درد وغم میں مبتلا بھی کر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ زندگی کی حقیقت اور دوسروں کے کرب کو سمجھنے اور اس درد کو دور کرنے میں ان کا معاون ہو۔ اسی لئے وہ آخر میں حسرت واندوہ ویاس وغم کی بستی میں درد آفریں اور درد آشنا دونوں بننے کی تمنا کرتے ہیں۔

نظم میں تاثیر کی کمی نہیں۔ خوبصورت ترکیبوں اور تشبیہوں نے اسے بہت پر اثر اور جاندار بنا دیا ہے۔ جمیل مظہری کا مفکرانہ اور فلسفیانہ طرز بیان یہاں پوری طرح نمایاں ہوتا ہے۔

Class. B.A. Hons. Part II
Subject Urdu (50 Marks.)
Lesson No. 5 (Sarmaya-e- Adab)
SAAZ-E-MUSTAQBIL.
Lesson Writer:- Dr. EJAZ ALI ARSHAD.
Head Deptt of Urdu. B.N. College,
PATNA

(۱) ساز مستقبل پرویز شاہدی

(۱) شاعر کا تعارف :- نام سید اکرام حسین اور قلمی نام پرویز شاہدی ہے۔ لودی کٹرہ (پٹنہ سیٹی) میں ۳۰ ستمبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے۔

والد کا نام سید احمد حسین اور والدہ کا سیدہ عائشہ خاتون تھا۔ اپنے پردادا سید شاہد حسین کے نام پر خود کو اسی مناسبت سے شاہدی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پرویز شاہدی کی ابتدائی تعلیم پٹنہ میں ہوئی۔ بی اے کلکتہ سے اور ایم اے، پٹنہ سے پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں کلکتہ چلے آئے اور ۱۹۴۸ء سے کمیونسٹ پارٹی کی باضابطہ رکنیت حاصل کر لی۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۰ء کے دوران قید و بند کی تکلیفیں جھیلیں۔ اس کے بعد سی ایم، او ہائی اسکول کلکتہ اور دوسرے تعلیمی ادارہ کی ملازمت۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں شادی ہوئی اور مئی ۱۹۶۸ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "رقص حیات" اور "تثلیث حیات" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

پرویز شاہدی اردو ادب کی توانا تحریک یعنی ترقی پسند ادبی تحریک سے نہ صرف متاثر رہے ہیں بلکہ اس کے علمبرداروں میں ہیں۔ ان کے سبب سے کلکتہ کی ادبی فضا میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا ایک وسیع حلقہ قائم ہو گیا تھا مگر ان کے یہاں رومان کی لطیف پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف شاعری پر طبع آزمائی کی ہے مگر بنیادی طور پر وہ نظم اور غزل کے شاعر مانے جاتے ہیں۔

(۲) ساز مستقبل ——— خلاصہ اور تنقیدی جائزہ

پرویز شاہدی کی نظم "ساز مستقبل" ان کے پہلے مجموعۂ کلام "رقص حیات" مطبوعہ ۱۹۵۷ء کی ابتدائی نظم ہے اس نظم میں خوبصورت حسی، لمسی اور بصری پیکر ابھرتے ہیں، اور نظم کے مطالعے کے بعد یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ پرویز غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اس کے باوجود ناقدین نے اس نظم کی ہیئت پر اعتراض کرتے ہوئے اس میں ارتقائے خیال کی کمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ محمد سمیع احمد لکھتے ہیں کہ "ساز مستقبل" جہاں ارتقائے خیال سے خالی ہے وہاں ایک بات کو مختلف رنگوں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی بھی نظم کا تفصیلی مطالعہ کرنے کے بعد تقریباً اسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ ان کا بیان ہے۔

"یہ نظم مربوط ہے لیکن اس میں خیال کا ارتقاء نہیں پایا جاتا۔ ایک مرکزی تجربہ ضرور موجود ہے اور اس کو بہت ہی خوبصورت تصویروں اور تعبیروں کے ذریعہ مختلف اشعار میں پیش کیا گیا ہے مستقبل کی حقیقتیں حال کے ارمانوں میں آنکھیں جھپکاتی ہیں۔ کبھی یہ آرزوئیں پوری ہوتی ہیں اور کبھی نہیں پوری ہو پاتیں۔ مستقبل کے نغمات کو شاعر کا تخیل سن لیتا ہے۔ شاعر کی ذکاوت ذرات کو بولتی ہوئی سنتی ہے۔ ان دیکھے جلوے اس کی چشم بصیرت کے سامنے رقص کرتے ہیں۔ لمحات گنگناتے ہیں۔ زمان و مکان کی طنابیں سمٹ کر کھنچ آتی ہیں۔ امکانات کا حسن نظارہ ساماں ہوتا ہے۔ پرویز نے ایک ایک شعر میں اس کیفیت کو پیش کیا ہے۔ شاعر اپنے برش سے لطیف رنگ آمیزی کرتا ہے اور ایک نازک تجربے کو زندگی عطا کرتا ہے۔ تجربہ بہت بالیدہ نہیں ہوا۔ لیکن اس کی معنویت دل میں کسک پیدا کرتی ہے نظم کا اختتام بہت ہی تشفی بخش ہے۔ ترکیبیں خوب ہیں اور اضافات کا استعمال بہت ہی پر اثر ہے۔ مجموعی طور پر نظم میں بڑی شعریت پائی جاتی ہے۔ جذبہ اور تخیل کا کامیاب امتزاج ملتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب ان کی تنظیم اور لب و لہجہ کی غنائیت پر اثر ہے۔ یہ ایک کامیاب نظم ہے اس میں معنویت کا بھی حسن ہے اور اس کی پیش کش عمدہ ہے۔ وہاں اس کی تعمیری تراشیدگی اتنی بالیدہ نہیں پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاثراتی نظم ہے اور اس میں تعمیری اٹھان سے زیادہ ہلکے پھلکے رنگ و خطوط کی گلکاری ہے۔"

پرویز شاہدی کی اس نظم کے بارے میں جو کچھ اختر اورینوی نے لکھا ہے۔ اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ پرویز نے کوئی ایک تجربہ ارتقائے خیال کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود نظم میں تاثر کی کمی نہیں ہے۔ ذرا نظم کا جائزہ لیا جائے۔ آخر پرویز کہتے کیا ہیں؟ کتنے ہی خوبصورت مجسمے ایسے ہیں جو ابھی پتھروں میں چھپے ہوئے ہیں کیونکہ انہیں کسی سنگ تراش کی انگلیوں نے تراشا نہیں ہے۔ کتنے ہی لالہ و گلاب کے پھول ایسے ہیں جو ابھی کھلے نہیں ہیں (ناشگفتہ ہیں) مگر ذہن بلبل ان کے تصور سے فرحت محسوس کرتا ہے، کتنے ہی جلوے ایسے ہیں جن کو ابھی کسی نے دیکھا نہیں ہے اور وہ پردے میں چھپے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ کتنے ہی ایسے نغمے ہیں جو نہ تو سنائے گئے نہ سنے گئے۔ پھر بھی وہ دل کے تاروں کو چھیڑتے رہتے ہیں، کتنے ہی ایسے دیئے ہیں جو جلائے نہیں گئے پھر بھی رات ہوتے ہی جھلملانے لگتے ہیں نہ معلوم کس نے مستقبل کا ساز چھیڑ دیا ہے کہ آج لمحے گنگنا رہے ہیں۔

یہی مختصر سی نظم ہے جس کے سرسری مطالعے سے بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نظم میں ایک مرکزی خیال بہر حال موجود ہے۔

شاعر کے پیش نظر شاید غالب کا یہ مصرع ہے۔ ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج

وہ آنے والے دنوں کے تصور میں ہے اور اسی تصور سے فرحت محسوس کرتا ہے اور یہ کام شاعر کے علاوہ کوئی دوسرا آسانی سے کر بھی نہیں سکتا۔ اس کے تصور کی آنکھ ان پتھروں کو دیکھتی ہے جو ناتراشیدہ ہیں مگر وہ پتھروں کی تراش خراش کے بعد نئی مورتوں اور رنگ برنگی تصویروں کو نکلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ بن کھلے پھولوں کو کھلتے ہوئے دیکھتا ہے، پردے میں چھپے ہوئے جلوؤں کے باہر آنے کا نظارہ کرتا ہے۔ مستقبل کے غنچوں کو سنتا ہے اور نئے چراغوں کو روشن ہوتے دیکھتا ہے۔ یہ سب کچھ سرسبز و شاداب تصور کے سہارے ہوتا ہے اور شاعرانہ تصور کے سہارے مستقبل کی ایک خوشگوار تصویر بنا کر خوش ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ساز مستقبل چھیڑنے والا شاعر ہمیشہ رجائیت پسند ہوتا ہے۔ وہ حال کی بے رونقی سے ہراساں یا مایوس نہیں ہوتا بلکہ آنے والے دنوں سے امید رکھتا ہے۔ یہی حال پرویز شاہدی کا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو نظم کا مرکزی خیال بس یہ ہے کہ مستقبل اپنے اندر بہت سارے امکانات رکھتا ہے۔ اس لئے مستقبل کی طرف سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہئے۔ اس خیال کو واضح کرنے کے لئے مختلف مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

اب رہی بات ارتقائے خیال کی تو اس سلسلے میں اکثر ناقدین کی یہ رائے ماننی ہی پڑتی ہے کہ نظم ارتقائے خیال سے خالی ہے حالانکہ ایک ہی خیال کو مثالوں سے واضح کرنے کے سبب احساس میں شدت بھی پیدا ہوئی ہے اور وسعت بھی مگر بات آگے نہیں بڑھی۔ اور یہ صورت پرویز کی دوسری نظموں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ عام طور پر نظم میں مفرد خیالات کو یکجا کر دیتے ہیں اس طرح تمام اشعار مل کر بھلے ہی کوئی تاثر پیدا کریں مگر ہر شعر الگ الگ بھی بامعنی ہوتا ہے اور غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے مثال کے طور پر اسی نظم کو دیکھئے ؎

کتنے اصنام ناتراشیدہ
پتھروں ہی میں کسمساتے ہیں

یہ شعر بغیر کسی سیاق و سباق کے اپنی جگہ پر مکمل ہے اور یہی حال دوسرے شعروں کا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پرویز شاہدی کی نظم نگاری پر ان کی غزل گوئی کے اثرات پڑے ہیں۔

"ساز مستقبل" میں لفظوں کا استعمال بڑے سلیقے سے ہوا ہے۔ "ناتراشیدہ اصنام" کے باہر نکلنے کی کوشش کو کسمسانے کا لفظ بڑی لطافت سے ظاہر کر دیتا ہے۔ یہی صورت ناشگفتہ لالہ و گل کے تصور سے بلبل کے ذہن میں گدگداہٹ پیدا ہونے کی ہے۔ مجموعی طور پر نظم پُر تاثیر ہے اور پرویز شاہدی کی اچھی نظموں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

Class B.A. Hons. Part II Subject Urdu (50 Marks)
Lesson No-6 (Sarmaya-e-Adab)
Ghazlat (Dagh, Jagana, Shaad, Hasrat,
Jigar, Firaq, Kalim, Ajiz)
Lesson Writer: DR. EJAZ ALI AKSHAD
Head Deptt of Urdu. B.N College

(1) داغ کی غزل گوئی کی خصوصیات

بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور دہلی کی مغلیہ

سلطنت کے مکمل زوال کے بعد دہلی سے شاعروں کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے رامپور گئی، کیونکہ یوسف علی خاں ناظم تاجدار رام پور

خود سخن فہم بھی تھے اور شاعر بھی۔ انہیں ہجرت کرنے والوں میں نواب مرزا خاں داغ (پیدائش ۱۸۳۱ء - وفات ۱۹۰۵ء) بھی تھے جو سات برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ چونکہ ان کی ماں نے بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو سے شادی کر لی تھی اس لئے ان کی پرورش قلعہ معلّی میں ہوئی تھی اور ابتدا سے ہی شعر و سخن سے واسطہ رہا تھا۔ رام پور کے دربار سے وابستگی، وہاں کے ادبی ماحول اور قدر دانی نے داغ کی شاعری کو نئی قوت اور چمک بخشی۔ آخر عمر میں داغ حیدر آباد چلے گئے اور والیٔ دکن کے استاد مقرر ہوئے۔ گلزار داغ، مہتاب داغ، یادگار داغ اور مثنوی فریاد داغ وغیرہ داغ کی یادگار ہیں۔ داغ نے ایک عرصے تک اقبال کو مشورۂ سخن دیا تھا۔

داغ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی غزلوں میں حسن و عشق کے معاملات رنگینی، شوخی، معاملہ بندی، زبان کی صفائی اور تشبیہات و استعارات کی دلکشی کا جو منظر ملتا ہے وہ دوسروں کے یہاں دکھائی نہیں دیتا۔ انداز بیان کی بے باکی، زبان کی لطافت، محاوروں کا لطف اور قادر الکلامی وغیرہ ان کی غزلوں کی ایسی خصوصیات ہیں جو اس عہد کے دوسرے غزل گو شاعروں سے انہیں ممتاز کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں گہرائی کم ہے، درد و گداز کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے مگر شباب اور سرمستی کی کیفیت ہر جگہ نمایاں ہے جو کبھی کبھی حد سے آگے بڑھ جاتی ہے تو گراں گزرتی ہے۔ مجموعی طور پر بقول ڈاکٹر اعجاز حسین ان کے یہاں حسن اور محبت دونوں شوخ اور بے حجاب ہیں۔

(۲) داغ کی داخل نصاب غزل کے اہم اشعار کی تشریح (برائے نمونہ)

مطلع: داغ نے اس شعر میں عشق کی بے قراری اور وصال یار کی صورت میں عاشق کی حیرانی و پریشانی کو ظاہر کیا ہے۔ کوئی ایسی چیز جسے پانے کی تمنا شدید ہو اگر کبھی مل جائے تو انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے۔ خوشی سے وہ بے قابو ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اس عاشق کی ہوتی ہے جسے وصال یار نصیب ہو جائے۔ وہ کبھی سوچتا ہے کہ اپنا نثار کر دے۔ پھر سوچتا ہے کہ صرف دل نثار کرنے سے کیا ہوگا۔ جان ہی کیوں نہ صدقے کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ داغ نے عاشق کی بے قراری کو فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا یہ شعر ان کے رنگ سخن کی تصویر ہے۔

پہلا شعر: اس شعر میں داغ معشوق کی بے وفائی کا ایک خوبصورت انداز میں شکوہ کرتے ہیں۔ معشوق ظالم اور بے وفا ہے۔ وہ وعدہ کر کے بھی نہیں آتا اور ایسا بار بار ہوتا ہے۔ تب داغ اس سے ایک معصوم سا سوال کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح کوئی اس کے ساتھ جھوٹے وعدے کرتا تو کیا اسے کسی تازہ وعدے پر اعتبار آجاتا۔ اس سوال کا انداز ہی جواب کو سامنے لا رہا ہے یعنی اس طرح کے جھوٹے وعدوں پر کسی کو اعتبار نہیں آسکتا۔ معاملات حسن و عشق کی پیش کش میں داغ کا جواب نہیں ہے۔ یہ شعر اس کا ایک ثبوت ہے۔

(۳) یگانہ کی غزل گوئی کی خصوصیات

یگانہ کا نام مرزا واجد حسین ہے ۱۸۸۳ء میں عظیم آباد (پٹنہ) کے مشہور محلے مغلپورہ میں پیدا ہوئے۔ پہلے یاس تخلص کرتے تھے۔ بعد میں یگانہ ہو گئے۔ ابتدا میں مولوی سید علی خاں بیتاب سے مشورۂ سخن کیا۔ بعد میں شاد عظیم آبادی سے اصلاح لینے لگے۔ پہلے کلکتہ پھر لکھنؤ گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ مگر اپنی مخصوص افتاد طبع کے سبب ہمیشہ لوگوں سے ناچاقی رہی۔ جس کے سبب معرکہ آرائیاں ہوئیں اور طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر انہیں معرکہ آرائیوں نے ان کے فن کو جلا بخشی۔ اور ان کی غزلوں میں ایک انفرادی رنگ پیدا ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء میں یگانہ کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔

یگانہ کی غزلوں کی سب سے نمایاں خصوصیت زور کلام ہے۔ ان کے یہاں بندش بہت چست ہے اور بلند مضامین کے لئے ایسے الفاظ لاتے ہیں جو مفہوم کو ابھار کر پوری طرح قاری کے ذہن میں بٹھا دیتے ہیں۔

یگانہ کے لب و لہجے کا تیکھا پن انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے ان کے آہنگ کے اس مخصوص تیکھے پن کو طنز سے تعبیر کیا ہے مگر اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرے ناقدین نے اس کا رشتہ یگانہ کے انفرادی

مزاج اور طرز زندگی سے جوڑا ہے اسے ہم ایک طرح کی خود آگاہی نازا اور خود ستائی بھی کہہ سکتے ہیں۔
یگانہ کی غزل میں صفائی اور بے باکی ہے۔ فن پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے۔ اس لئے بند اور پیچیدہ خیالات کی پیش کش کے باوجود تغزل کا عنصر کم نہیں ہوتا۔ دل کشی باقی رہتی ہے۔ یگانہ کے یہاں تشبیہات و استعارات کا استعمال کم مگر جدت اور ندرت کے ساتھ ہوا ہے۔

(۴) یگانہ کی داخل نصاب غزل کے اہم اشعار کی تشریح (بطور نمونہ)

چوتھا شعر : یگانہ نے اس شعر میں ندرت بیان کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ انسان زندگی اور ہستی کی ناپائیداری ظاہر ہے اور اردو کے مختلف شعرا اسے اپنے اپنے طور پر بیان کرتے رہے ہیں۔ یگانہ بھی اس بے ثباتی حیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہاڑ کاٹنے والے ہوں یا اپنی ذات کو دریا اور سمندر بنانے والے، سب آخر کار اسی زمین کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ مگر یگانہ اپنے منفرد انداز سخن کے سبب اس عام سی بات میں بھی معنی کی ایک اور سطح پیدا کر دیتے ہیں، وہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمین کی انکساری اور پستی پر نہ جاؤ۔ اسی میں نہ معلوم کتنے دریا سما جاتے ہیں اور بڑے بڑے پہاڑ کاٹنے والے اسی مٹی میں مٹی بن جاتے ہیں۔ گویا خاکسارانِ زمانہ کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔

مقطع : اس شعر میں یگانہ نے انسانی ذات کی حقیقت واضح کرنی چاہی ہے۔ انسان کی ذات ابتدا سے ہی نافہم رہی ہے یہ ایک ایسا معمہ ہے جو سمجھانے کا ہے نہ سمجھنے کا۔ انسان خود کو اعلیٰ بھی سمجھتا ہے اور ادنیٰ بھی۔ امیر بھی اور فقیر بھی۔ کبھی وہ منصور کی طرح انا الحق (میں ہی خدا ہوں) کا نعرہ لگاتا ہے اور کبھی صوفیوں کی طرح اپنی ہستی کو اس قدر بے وقعت سمجھتا ہے کہ وہم، تخیل اور پرچھائیں قرار دیتا ہے۔ مگر انسانی عقل اور سمجھ اتنی محدود ہے کہ دنیا کا راز کیا جائے گی، خود اپنی ہی ہستی کا صحیح عرفان حاصل کرنے میں ناکام ہے۔ یگانہ یہاں اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کیا ہوں (یعنی انسان کیا ہے) ورنہ میں تو خود کو خود کے سمجھنے میں بہت کچھ سمجھنے لگتا ہوں۔ اسی طرح کا ایک اور شعر جو یگانہ نے کہا ہے ملاحظہ ہو ؎

خودی کا نشہ چڑھا ہوش میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

(۵) شاد کی غزل گوئی کی خصوصیات

سید علی محمد شاد عظیم آبادی ۱۸۴۶ء میں عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ الفت حسین فریاد کے شاگرد تھے۔ ادب کی مختلف صنفوں پر طبع آزمائی کی اور نظم و نثر دونوں میں یادگار تحریریں چھوڑیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل گو ہی کی حیثیت سے مشہور ہوئے ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

شاد کی غزل میں سب سے نمایاں خوبی موضوعات کی پاکیزگی اور انداز بیان کی صفائی ہے۔ ان کے عہد میں داستان لکھنؤ کے زیر اثر اردو غزل کا مزاج فحاشی اور عریانی کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ شاد نے ان برائیوں سے دامن بچایا اور غزلوں کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ ان کی شاعری کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے :۔

شاد کی شاعری حسن و عشق کے عامیانہ اور شوقیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک ہے۔ پاک بازانہ حسن و عشق، رزم و بزم کی دلکش روداد کے علاوہ ان کی شاعری میں اخلاق، فلسفہ، تصوف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں۔ حسن و عشق کی داستان سرائی میں میر سی سادگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ سہل الفاظ چھوٹے

فقرے اور سادہ ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔ بیان میں لذت ہے۔ اکثر میر ہی کے اوزان اور بحور کو اختیار کیا ہے۔ وہی انداز بیان وہی فقیرانہ صدا ہے۔ اس لئے شاد کو اس دور سخن کا میر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

شاد کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کرنے والے بیشتر ناقدین نے انہیں خیالات سے استفادہ کیا ہے اور یہ اعتراف کیا ہے کہ شاد نے دبستان دہلی، اور دبستان لکھنؤ کی غزل گوئی کے درمیان ایک اعتدال کا راستہ نکالا ہے۔

(۶) شاد کی داخل نصاب غزل کے اہم اشعار کی تشریح (بطور نمونہ)

مطلع :۔ شاد عظیم آبادی کا یہ مطلع بہت مشہور ہے۔ اس میں شاد نے انسانی زندگی کی ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس طرح بچہ کھیلونوں سے بہل جاتا ہے اسی طرح انسان تمناؤں میں بہلا رہتا ہے۔ حالانکہ انسان دنیا میں بہت سے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے اور یہ دنیا دراصل آخرت کی تیاری ہے مگر یہاں ہر قدم پر ہزاروں دلچسپیاں اس کے دامن دل کو کھینچتی ہیں۔ غالب نے کہا تھا کہ یہاں ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں کہ جن میں سے ہر خواہش پوری کرنے کے لئے جان دے دینے کا دل چاہتا ہے۔ انہوں نے دنیا کو تماشہ بھی قرار دیا تھا۔ شاد بھی کم و بیش اسی خیال کے حامی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی دلچسپیاں دراصل کھلونے ہیں۔ انہیں حاصل کرنے کی تمنا میں انسان اپنی تخلیق کا اصل مقصد بھول جاتا ہے اگر آرزوئیں نہ ہوتیں تو شاید دنیا میں انسان کا دل بھی نہ لگتا۔

آخری شعر :۔ شاد کہتے ہیں کہ انسان دنیا کی بھری پری محفل سے اٹھوا لیا جاتا ہے۔ موت اسے ایک لمحے کی مہلت نہیں دیتی۔ وہ منہ اس لئے چھپائے ہوئے دنیا سے جاتا ہے کہ بھری ہوئی محفل سے اٹھا لیا گیا ہے۔ اس طرح گویا اس کی بے عزتی ہوئی ہے۔ اس شعر میں نزاکت خیال سے کام لیا گیا ہے۔

(۷) حسرت کی غزل گوئی کی خصوصیات

سید فضل الحسن حسرت موہانی ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڈھ سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تحریک آزادی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی خدمات وسیع ہیں مگر غزل گوئی ان کا خاص میدان ہے۔ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۳ء تک ان کی غزل گوئی کا بہترین دور ہے۔

حسرت کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں ان کی زندگی کی سچی آئینہ داری ملتی ہے۔ انہوں نے خود ہی لکھا ہے ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ظاہر ہے کہ ان کے کلام پر سیاسی حالات کا عکس پڑا ہے۔ اس کے باوجود غزل میں کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ انہوں نے غزل کو محض حسن و عشق کے معاملات اور واردات قلب کے بیان تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ دوسری طرح کے خیالات بھی پیش کئے ہیں زمانے کی ناقدری کا گلہ، دوستوں کی شکایت، سیاسی حالات کی غیر یقینی صورت وغیرہ بھی ان کی غزلوں کے موضوعات ہیں۔

حسرت کی غزلوں میں یاس و غم اور عیش و نشاط دونوں کی تصویریں ملتی ہیں وہ زاہد خشک نہیں ہیں مگر ان کا محبوب پردہ دار ہے اور ہوا و ہوس میں نہیں پڑتا۔ محبت کی ہلکی ہلکی آنچ ہی حسرت کے تغزل کی پہچان ہے جو عام طور پر شوخی کی سرحد سے آگے نہیں بڑھتی۔ ان کی غزلوں کا اسلوب رواں دواں، شگفتہ اور عام فہم ہے۔ فارسی ترکیبوں اور لفظوں کا استعمال انہوں نے کم کیا ہے۔

(۸) حسرت کی داخلِ نصابِ غزل کے اہم اشعار کی تشریح (بطور نمونہ)

مطلع :۔ حسرت کے اس شعر میں بظاہر تغزل ہے مگر اس کا ایک پہلو عشق حقیقی کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ حسرت اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جیسے نگاہ ناز سارے رازوں سے آگاہ کر دے وہ اپنی قسمت کی خوبی پر جس قدر فخر کرے کم ہے کیونکہ نگاہ ناز ہی تو سارے رازوں کو جاننے والی ہے۔

تیسرا شعر :۔ حسرت کہتے ہیں کہ آپ کا حسن کرشمہ دکھانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں یہ صلاحیت ہے کہ خرد کا نام جنوں اور جنوں کا خرد رکھ دے اور لوگ تسلیم کر لیں شعر میں بظاہر عشق مجازی کی کرشمہ سازی کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے عقل مند مجنوں اور مجنوں عقل مند بن جاتے ہیں مگر یہ شعر ایک لطیف طنز بھی اپنے اندر رکھتا ہے جس کے سبب کوئی انہونی بات رونما ہونے پر طنزاً بولا جاتا ہے۔

(۹) جگر مرادآبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات

علی سکندر جگر مرادآبادی ۱۸۹۰ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی نظر علی بھی شاعر تھے۔ جگر نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی اس لئے ان کے کلام میں گہرائی اور وسعت نظری سے زیادہ رندی اور سرمستی کی کیفیات ملتی ہیں۔ ان کی غزلوں کا خاص موضوع عشق مجازی ہے۔ ان کی شاعرانہ خدمات کے اعتراف میں انہیں "آتش گل" پر ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ ۱۹۶۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

جگر کی غزل گوئی میں کلاسیکی اردو شاعری کے سارے نقش نظر آتے ہیں۔ شوخی، معاملہ بندی، معشوق کی سراپا نگاری، کیف وارفتگی اور والہانہ پن ان کی غزلوں کی ایسی خصوصیات ہیں جو انہیں دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں کا اسلوب بے حد سادہ اور رواں ہے اور کبھی سخت الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ ان کی استعمال کردہ ترکیبیں عام فہم اور دلکش ہوتی ہیں۔ لفظوں کی تکرار سے بھی وہ لطف بیان پیدا کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا بڑا حصہ عشق مجازی کے مختلف پہلوؤں سے عبارت ہے اس کے علاوہ شراب کا بھی ان کے یہاں بار بار تذکرہ آیا ہے جو ان کی ذاتی زندگی میں شراب سے وابستگی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ آخری عمر میں انہوں نے شراب نوشی ترک کر دی تھی اور تصوف کی طرف مائل ہونے لگے تھے جس کے اثرات ان کی غزلوں پہ نمایاں ہیں۔

(۱۰) جگر مرادآبادی کی داخلِ نصابِ غزل کے اہم اشعار کی تشریح (بطور نمونہ)

مطلع :۔ جگر مرادآبادی کی غزل کا یہ مطلع بے حد مشہور ہے اس میں وہ محبت کی حقیقت واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ محبت بظاہر ایک حقیر سی شئے ہے جو عاشق کے دل تک محدود رہتی ہے مگر اس کی وسعت کا یہ حال ہے کہ پوری دنیا پر یہ محیط ہے۔ گویا محبت کی طاقت لامحدود ہے۔ شعر میں والہانہ پن ہے۔

پہلا شعر :۔ جگر مرادآبادی نے اس شعر میں عاشقوں کی عظمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شعر میں بھرپور تغزل اور والہانہ پن ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ خاک نشینوں، فقیروں اور غریب عاشقوں کو معمولی انسان نہیں سمجھنا چاہیئے۔ جو لوگ بوریا نشیں ہوتے ہیں، وہ زمانے کو اپنی ٹھوکروں میں رکھتے ہیں گویا دنیا ان کے اشاروں پر رقص کرتی ہے۔ شعر بظاہر عشق مجازی سے متعلق ہے مگر اس میں عشق حقیقی کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

(۱۱) فراق کی غزل گوئی کی خصوصیات

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری (پیدائش ۱۸۹۶ء وفات ۱۹۸۲ء) شاعری میں مصحفی سے متاثر رہے ہیں انہوں نے انگریزی ادب و شاعری کے مطالعے سے بھی کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ ہندی شاعری کے اثرات بھی قبول کئے ہیں انہوں نے نظمیں اور رباعیاں بھی کہی ہیں اور انہیں ادب کا سب سے بڑا ہندستانی انعام گیان پیٹھ ایوارڈ ملا ہے۔ ان کی رباعیاں کافی مشہور ہیں مگر بنیادی طور پر وہ غزل ہی کے شاعر ہیں۔

فراق کی غزلیں اپنی معنویت، ندرت تخیل اور طرز اظہار کی انفرادیت کے سبب اردو شاعری کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ پروفیسر محمد حسن نے ان کی انفرادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

" فراق کی غزل کا انوکھا پن، ان کی عشقیہ شاعری کا نیا لہجہ ہے یہ عشق نہ سطحی ہے نہ متصوفانہ اس میں عالمی عرفان کی تہہ داریاں ہیں فراق کے نزدیک عشق مادی اور جسمانی سطح سے شروع تو ہوتا ہے مگر اس سطح پر ختم نہیں ہوتا، وہ مادی آسودگی اور جسمانی لذتیت سے پاک کر کے عشقیہ شاعری کو جذباتی تطہیر سے آشنا کراتے ہیں۔

(۱۲) کلیم عاجز کی غزل گوئی کی خصوصیات

کلیم عاجز دور حاضر کے اہم غزل گو شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی پر میر کے لب و لہجے کے اثرات صاف محسوس کئے جا سکتے ہیں مگر خود کلیم عاجز کا کہنا ہے کہ وہ میر کے مقلد نہیں ہیں یہ دوسری بات ہے کہ میر کی طرح انہوں نے بھی اپنی داستان غم کو دنیا کی داستان بنا دیا ہے۔ اس لئے جب ان کے اپنے زخموں نے دنیا کے دوسرے لوگوں کو لگے ہوئے زخموں سے رشتہ جوڑا ہے تو ان کی شاعری وجود میں آئی ہے۔

دراصل کلیم عاجز کی غزلیں ایک خاص عہد اور معاشرے کا آئینہ خانہ بھی ہیں اور ماتم کدہ بھی۔ یہ تقسیم ہند سے قبل کا عہد اور معاشرہ ہے جو آزادی ہند کی قربان گاہ پہ قربان ہو گیا ہے۔ کلیم عاجز اس مشترک تہذیب کے حامل معاشرے کے مشاہد بھی ہیں اور عاشق بھی۔ اس لئے وہ اس کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں اور اس کے مٹنے کا افسوس بھی۔ یہی افسوس کبھی کبھی احتجاج بن جاتا ہے۔ مگر اس احتجاج میں شیرینی، لطافت اور نرمی ہے اس لئے اس کا اثر دیر پا رہتا ہے۔